صریرخامہ
SAREER A KHAMA
TAFHEEM RESEARCH CENTRE
Category Y
ISSN Online: 3005-947X
ISSN Print: 3005-9461
Vol: 05, Issue 01 (Jan-March 2026)

اسلامی تحقیق کا منہج: روایت، درایت اور اسماء الرجال (تجزیاتی مطالعہ)

The Methodology of Islamic Research: Narration, Critical Study and the Biographies of Hadith Narrators (An Analytical Study)

Nasar Iqbal
Subject Specialist Urdu, Punjab School Education Department
nasar.grt777@gmail.com

Tayyaba Muhammad Ali
Subject Specialist Urdu, Punjab School Education Department
tayyabamuhammadali7@gmail.com

Mushtaq Ahmad
Chief Editor, Monthly Dareecha e Qiayas Lahore
mushtaqkharal46@gmail.com

Abstract:
Research is a process of systematic inquiry that entails collection of data documentation of critical information and analysis and interpretation of that data. It is a process to discover new knowledge. Research methodology starts from the beginning of Islam. In fact, this methodology urges people to get authentic information about Qur'an and Hadith. Islamic research period is the golden era for Muslims. Especially after 40th Hijri it was inevitable to get true information about Qur'an o Hadith. In golden age of Islamic history much of the historically Islamic world was ruled by various caliphates, and science. Economic development and cultural works flourished.

Keywords: *Entails, Research Methodology, Quran and Hadith, Systematic, Interpretation, Critical, Era, Inevitable, Flourished*

تعارف:

تحقیق کا آغاز اسلام کی تعلیمات سے ہوتا ہے۔ نبی کریم ﷺ کی احادیثِ مبارکہ اور قرآن پاک میں مسلمانوں کو حق کی تلاش کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ مسلمانوں کو علم و تحقیق کے متعلق خاص توجہ دینے کی تلقین کی گئی ہے۔ تحقیق کا آغاز رسول پاک ﷺ کے دور میں ہی ہو گیا تھا۔ صحابہ اور تابعین نے تحقیق کے ذریعے احادیث کو محفوظ کیا، اور آگے پہنچایا۔ یہ دور مسلمانوں کا سنہری دور تھا، خلفائے راشدین کے زمانے میں ہی اسلام کا جھنڈا یورپ میں بھی لہرایا گیا، یوں باقاعدہ نئی نئی ایجادات کا آغاز ہوا، اور ان جدید ایجادات کا سہرا مسلمانوں کے سر جاتا ہے۔ اسلامی تعلیمات کے مطابق مسلمانوں نے تحقیق کے میدان میں قدم رکھا اور دنیا کو پرانی اور نئی ایجادات کے زیور سے آراستہ کیا۔

40 ہجری کے بعد جب خلفائے راشدین کا عہد ختم ہوا تو تاریخ میں بہت سے مسائل جنم لینا شروع ہو گئے۔ تاریخ کے حوالے سے ابن خلدون لکھتے ہیں کہ ایک نسل کی عمر 40 سال تک ہوتی ہے۔ جب نئی نسل سامنے آئی تو حضور اکرم ﷺ کی حدیث کے حوالے سے پہلے سے موجود صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے سنا گیا اور پھر راویوں کو پرکھنا ضروری ہو گیا۔ ایسے حالات میں روایت پر زور دیا گیا۔ احادیث کی جانچ پرکھ کے لیے ان مسائل کو حل کرنے کے لیے دو اصول اختیار کیے گئے جن میں پہلا اصول روایت تھا اور دوسرا درایت تھا۔

روایت سے مراد جو چیزیں شروع سے ہی چلتی آ رہی ہوں۔ یعنی سینہ بہ سینہ۔ معروف اردو فرہنگ، فرہنگ آصفیہ میں روایت کے معنی لکھتے ہوئے دہلوی (1) رقم طراز ہیں:

"روایت: اسم مونث: کسی کی بات کی نقل، کسی کی بات بیان کرنا، اظہارِ ذکر، شکایت"

اصطلاحی مفہوم میں اسلامی تحقیق میں حضرت محمد ﷺ کے قول، فعل یا واقعے کو بیان کرنے والے کو راوی کہتے ہیں خواہ اس نے قول، فعل یا واقعہ خود سنا ہو یا کسی اور سے۔ کسی قول کے بیان کرنے میں جتنے بھی لوگ شامل ہیں اسے روایت کا عمل کہتے ہیں۔ جبکہ درایت ایسا علم ہے جس کے ذریعے سے راوی کی سند بھی لی جائے اور ساتھ ہی ساتھ روایت کے متن کو بھی پرکھا جائے۔ روایت اور درایت میں واضح فرق یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ روایت اصول وضع کرنے کا نام ہے۔ اس کے اصول راوی سے متعلق ہوتے ہیں۔ روایت خارجی تحقیق ہے۔

درایت کے حوالے سے عباسی (2) لکھتے ہیں:

"اصول درایت سے مراد محدثین حضرات کے وضع کردہ سنہری قواعد و ضوابط ہیں جن کے ذریعے متن حدیث کے متعلق تحقیق کی جاتی ہے کہ واقعی وہ حدیث رسولؐ ہے یا کہ نہیں؟"

درایت میں بھی اصول وضع کیے جاتے ہیں۔ اس میں راوی کے ساتھ ساتھ متن کی بھی جانچ پرکھ کی جاتی ہے۔ اندرون داخلی شہادتوں سے اس کا تعلق ہے۔ روایت میں دیکھا جاتا ہے کہ کون کہہ رہا ہے جبکہ درایت میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ کیا کہہ رہا ہے۔ روایت محدود ہوتی ہے جبکہ درایت لامحدود ہے۔ اس میں انسانوں کا علم بھی ہے اور متن کو بھی پرکھا جاتا ہے۔ درایت وسیع علم ہے۔

اسلامی تحقیق کے اصول وضوابط کی ضرورت کیوں پیش آئی؟

حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے وصال کے بعد جب ایک نئی نسل سامنے آئی تو کچھ نئی نئی باتیں پھیلائی جانے لگیں۔ جن میں بہت سی باتیں شکوک و شبہات کو جنم دینے لگیں اور خارجی فتنے بھی سامنے آنا شروع ہو گئے۔ لوگوں نے اپنی طرف سے بھی احادیث کی تشریح کرنا شروع کر دی۔ معاشرے میں کچھ لوگوں نے منافقین کے ساتھ مل کر پیسے دے کر احادیث لکھوانا شروع کر دیں۔ عجمی کو عربی زبان میں حدیث سمجھنے میں مسائل

کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ اصل حدیث کا مفہوم واضح نہ کر سکے۔ ذاتی نفع کے لیے بھی غلط احادیث پھیلانا شروع کر دی گئیں۔ کچھ لوگوں نے شہرت حاصل کرنے کے لیے اور منافع حاصل کرنے کی خاطر اپنی مرضی کے مطابق احادیث کے مفاہیم پیش کرنا شروع کر دیے۔ ایسے حالات پر قابو پانے کے لیے سب سے پہلے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس بات پر زور دیا کہ جرح و تعدیل کی جائے اور اس کے لیے اصول وضع کیے جائیں۔

روایت حدیث کے ضمن میں سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا تذکرہ کرتے ہوئے ظفر (3) لکھتے ہیں:

"اگرچہ آپ روایت حدیث میں بہت محتاط تھے لیکن جب ضرورت پڑتی تو وہ اسی وقت استدلال کرتے۔"

چنانچہ فن سیرت، اسماء الرجال، شخصیت و کردار، کہاں سے بات سنی، کس نے بیان کی، وغیرہ وغیرہ کے لیے مخصوص شرائط مقرر کی گئیں اور طے پایا کہ ان شرائط و ضوابط کے بغیر روایت کو تسلیم نہیں کیا جائے گا۔

صحابہ کرام کے بعد تابعین، تبع تابعین، آئمہ کرام نے بھی ان اصولوں پر سختی سے عمل کیا۔ ابن عباس، انس بن مالک، سعید بن مصیب نے روایت و درایت کے علم کو ایسا علم بنا دیا جسے دوسری قوموں نے بھی مانا اور جس کے ذریعے لاکھوں افراد کے حوالے سے بھی پرکھا جا سکتا ہے۔ راویوں کے اسماء کے سلسلے کو بھی پرکھنا ضروری قرار دیا گیا۔ جیسا کہ راوی کا سلسلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچنا ضروری ہے۔

روایت کے اصول:

روایت کے چند بنیادی اصول درج ذیل ہیں:

1۔ تحقیق کا مفہوم اصل بات تک پہنچنا ہے لہٰذا روایت کے سلسلے میں تحقیق کر لی جائے۔ بغیر تحقیق کے تسلیم نہ کیا جائے، تحقیقی رویہ اختیار کیا جائے، مکمل طور پر پرکھا جائے، علم کی کسوٹی پر پرکھا جائے، انسانی اقدار کے مطابق بھی پرکھا جائے، بنیاد قرآن میں ہی رکھی جائے۔

قرآن مجید میں ارشاد ربانی ہے۔ بحوالہ (4):

"يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْٓا"

ترجمہ: "اے ایمان والو! کوئی فاسق خبر لے آئے تو تحقیق کر لو"

2۔ ہر بات کو پرکھ لیا جائے، سیاق و سباق پر غور کرنے کے بعد تسلیم کیا جائے۔

3۔ کسی بھی حدیث کو پرکھنے کے لیے یہ دیکھا جائے کہ وہ عقل کے مطابق ہو کیونکہ اسلام دین فطرت ہے۔ عقل کے خلاف بات تسلیم نہ کی جائے۔ جیسا کہ حضرت نوحؑ کی کشتی کی مثال دی جاتی ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی نے طواف کعبہ کیا، دو رکعت نفل ادا کیے، یہ غلط مشہور ہو گیا ہے۔ اسی طرح 1965ء کی جنگ میں بم کے واقعات وغیرہ بھی بغیر تحقیق کے غلط منسوب کر دیے گئے ہیں۔ مشتبہ راوی کو قبول نہ کیا جائے۔

راوی عاقل، بالغ ہو، دیوانہ نہ ہو، غیر متعصب ہو، دوسروں سے نفرت نہ کرتا ہو، لالچی نہ ہو، جھوٹا نہ ہو، دھوکے باز نہ ہو، کردار کا ٹھیک ہو۔

4۔ کسی بات کو دوسرے تک پہنچاتے وقت قیاس یعنی خود ہی سوچ لے یا راوی کا قیاس ہو تو تحقیق کر لی جائے۔ یعنی حدیث کے راویوں کے قیاس اور اصل واقع میں تحقیق کر لی جائے۔ مثال یوں دی جا سکتی ہے۔ ایک دفعہ آپؐ ازواج سے ناراض ہو کر الگ ہوئے۔ راوی نے قیاس کیا کہ شاید طلاق ہو گئی ہے۔ فقہی قیاس کی تحقیق بھی لازمی ہے لیکن حقیقت ایسی نہ تھی۔ حق تک پہنچنے کی کوشش کرنا تحقیق کہلاتا ہے۔

5۔ کسی حدیث کو پرکھتے وقت روایت کو تاریخ اور زمانہ نبوت کے حوالے سے جانچا جائے۔ راوی بہت بعد کا ہے تو اس کی حدیث کو کمزور قرار دیا جا سکتا ہے۔ آپ ﷺ کے زمانے کے راوی کی حدیث کو درست کہا جا سکتا ہے۔ راوی اور رسول اللہ ﷺ کے درمیان کوئی تیسرا واسطہ نہ ہو۔ عصری قربت بہت ضروری ہے۔ براہ راست حضورِ اکرم ﷺ سے کوئی بات حاصل ہو سکے تو سب سے زیادہ مستند ہو گی۔

6۔ یہ دیکھ لیا جائے کہ سند متصل ہے۔ بعض احادیث ایسی ہوتی ہیں کہ ایک شخص نے دوسرے سے سنا، اس نے کسی اور سے سنا اور وہ کسی صحابی کے پاس سے سنتا ہے اور صحابی نے رسول اللہ ﷺ سے سنا تو ان واسطوں کی حدیث درست قرار دی جائے گی۔ تمام واسطوں میں تسلسل ہو۔

7۔ آخری روایت صحابی کی ہو، درمیان والے سلسلے بھی مسلسل ہوں، عقل تسلیم کرے، صحیح سند ہو، راوی کیسا ہے۔ اس کا کردار بہترین ہو، عالم، عاقل، بالغ راوی ہو، غیر جانبدار ہو اس کی بات کو تسلیم کیا جائے گا۔

8۔ روایت بالمعنیٰ: راوی الفاظ کا ماہر ہو، زبان کا بھی ماہر ہونا ضروری ہے۔ یہ بھی دیکھا جانا چاہیے کہ جو الفاظ آپ ﷺ نے ارشاد فرمائے ان سے موقع پر کیا مراد تھی۔ ان الفاظ کے علامتی معنیٰ نہیں لیں گے بلکہ حقیقی معنیٰ اور مفہوم کے مطابق معنیٰ لیں۔ اصل بات سیاق و سباق کے ذریعے معلوم کی جائے گی۔ بامعنیٰ متن روایت کیا جائے۔ الفاظ اور زبان کے ماہر نہ ہونے کی صورت میں روایت درست نہیں مانی جائے گی۔

9۔ مقبول راوی اگر ثقہ راوی کی حدیث پر اعتراض کرے تو اس کی بھی جانچ پرکھ کی جائے۔ شاذ حدیث کی تحقیق ضرور کرنی چاہیے۔ وہ حدیث جو شاذ ہی کہلائے اور ثقہ حدیثوں سے ٹکرائے۔ اسے قبول نہیں کیا جائے گا۔ شاذ حدیث کو قرآنی حکام کے ساتھ ملا کر پرکھا جائے۔ کیونکہ قرآن کو بنیادی ماخذ قرار دیا گیا ہے۔

10۔ واقعے کی نوعیت کا تعین کیا جائے کہ اصل واقعہ کیا ہے۔ حدیث کو قبول کرتے وقت دیکھا جائے کہ واقعہ قبول کرنے والا ہے۔ غیر معمولی واقعہ بیان کر دینے کی صورت میں خواہ وہ ثقہ راوی ہو، تحقیق کرنا ضروری ہے۔ اس فن میں مسلمانوں نے سخت محنت کی اور روایت کے اصولوں کو مقرر کیا۔

درایت:

عربی اصطلاح میں متن کو درایت کہتے ہیں۔ خوب کوشش کے بعد کسی چیز کا علم حاصل کرنا۔ ایسا علم جس کے ذریعے راوی روایت کی حقیقت تک پہنچ جائے۔ درایت کا تعلق سند اور متن دونوں سے ہے۔ سند خارجی علم ہے جبکہ متن داخلی شہادتیں ہیں۔ درایت خارجی اور داخلی دونوں طرح کا علم ہے۔ جبکہ روایت صرف سند تک محدود ہے۔ علم درایت کے حوالے سے قاسمی (5) لکھتے ہیں:

> "علم درایت کوئی نیا علم نہیں بلکہ ایک طرح سے علم مصطلح الحدیث سے پہلے وجود میں آیا۔ قرآن، حدیث اور عہد صحابہ میں اس کی بنیاد پائی جاتی ہے لیکن فن کی حیثیت سے یہ علم اس وقت سامنے آیا جب فتنہ وضع حدیث نمودار ہوا اور حدیثوں کی سند کے ساتھ ساتھ اس کے متن کی چھان بین کرنے کی ضرورت پیش آئی۔"

نبی کریم صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے وصال کے بعد صورتحال پر غلط وضع کردہ احادیث معاشرے میں پھیلنے لگیں لیکن وصال کے فوراً بعد صحابہ گہری نظر رکھتے تھے جب کہ بعد میں آنے والے لوگوں میں مشکلات پیش آئیں۔ یوں درایت کے علم کی ضرورت پیش آئی۔

درایت کے اصول:

1۔ درایت میں سند اور متن دونوں کو دیکھا جائے گا۔ ان کی پہچان کیا ہے اس کو مد نظر رکھتے ہوئے تین اقسام سامنے آتی ہیں۔ صحیح حدیث، ضعیف حدیث، موضوع وضع کردہ حدیث۔ اس علم کو علم درایت کا نام دیا گیا ہے۔ اسلامی تحقیق میں اس کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ درایت کے فن کے لیے علم اور مہارت دونوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ متون اور زبانوں کو بھی جاننا ضروری ہے۔

2۔ کسی بھی حدیث کا بنیادی اصول، قرآن کے خلاف حدیث قابل رد ہے۔ ایسی حدیث کو ضرور پرکھا جائے گا اور تحقیق کے بعد مانا جائے گا۔ کیوں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ "عقل دین کی اصل ہے اور علم میرا اتھیار ہے۔"

3۔ وہ بات جو فطرت انسانی کے مطابق ہو، جو حدیث خلاف عقل اور انسانی فطرت کے بھی خلاف ہو مثلاً کسی حدیث میں بیان آتا ہے کہ آگ پر پکی ہوئی چیز کھانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ ابن عباس نے اس حدیث کی تردید کر دی کیونکہ حلال چیز کو کھانے سے وضو کیوں ٹوٹے گا۔

4۔ اس عہد یا زمانے کے ماحول کے مطابق بات نہ ہو جیسے کوئی آپ ﷺ کے زمانے کے حوالے سے کہہ دے کہ میں بحری جہاز پر سوار ہو کر آپ کے پاس گیا اور حدیث سنی یعنی ماحول اور عہد اجازت نہ دے۔ یعنی کسی واقعہ کے ماحول کے مطابق بات نہ ہو تو وہ تسلیم نہیں کی جائے گی۔ تاریخی حقیقت کے خلاف بھی بات تسلیم نہ کی جائے گی۔

5۔ ایسی حدیث جو مشاہدات کے خلاف ہو، تسلیم نہ کی جائے گی۔

6۔ بازاری پن یا گھٹیا الفاظ والی حدیث کو فوراً رد کر دیا جائے گا۔

7۔ معمولی سی بات کو بڑھا چڑھا کر بیان کی گئی حدیث کو بھی پرکھنے کی ضرورت ہے۔

8۔ چونکہ کسی قوم، پیشے یا زبان سے حضورِ اکرم ﷺ نے نفرت کا اظہار نہیں فرمایا۔ ایسی حدیث جس سے فساد پھیلتا ہو اس حدیث کی درایت ضروری ہو گی۔

9۔ پیشین گوئی کر دی جانے والی احادیث کو بھی پرکھا جائے گا۔

10۔ وہ حدیث جو عمل سے دور کرے اس کی درایت کرنی چاہیے۔

اسماء الرجال:

علم درایت کی سب سے بڑی شکل اسماء الرجال ہے۔ اسماء الرجال آدمیوں کے ناموں کا علم ہے۔ اصطلاح میں وہ علم ہے جو روایت حدیث کے حوالے سے راوی کے اوصاف، حالات، سوانح، خاندان، راوی کے پورے ماحول کو سامنے لائے۔ اس کے خاندانی روایات اور راویوں کے حالات زندگی کے بارے میں تفصیلاً بیان کیا گیا ہو، اسماء الرجال کہلاتا ہے۔

اسلام میں تحقیق کے اصول:

اسلام میں تحقیق کے اصولوں کا اطلاق ان قواعد و ضوابط پر ہوتا ہے جنھیں اصل میں مسلمانوں نے احادیث رسول ﷺ کی جانچ پرکھ کے لیے وضع کیا اور ان کے ذریعے احادیث کو غیر احادیث سے الگ کر کے رکھ دیا۔ یہ اصول دو طرح کے ہوتے ہیں ایک روایتی اور دوسرا درایتی۔ ان قواعد و ضوابط کے پیشِ نظر ملت اسلامیہ کے علمائے کرام نے روایتی و درایتی اصول وضع کیے۔ اور انھیں ہر طرح کے علم سے متعلق مواد کی جانچ پرکھ کے لیے استعمال کیا۔ اقوامِ عالم میں کسی نے بھی اسلام سے پہلے اپنے پیغمبر کی باتیں صحیح ثابت کرنے کے ساتھ محفوظ کی ہوں۔ یہ شرف

صرف ملت اسلامیہ کو حاصل ہے کہ انھوں نے اپنے رسولؐ کے ایک ایک کلمہ کو صحت و اتصال کے ساتھ جمع کیا اور آج روح زمین پر کوئی ایسا مذہب نہیں ہے جو اپنے پیشوا کے ایک کلمہ کی سند بھی صحیح طور پر پیش کر سکے۔ اس کے بر عکس اسلام نے اپنے رسولؐ کی سیرت کے ایک ایک گوشے کو پوری صحت و اتصال کے ساتھ محفوظ کیا۔ مسلمانوں کا یہ بے مثل اہتمام مجرد حفظ و تدوین تک ہی محدود نہیں تھا بلکہ احادیث رسولؐ کو دشمنان اسلام کے حملوں سے بچانا، صحیح و سقیم احادیث میں امتیاز بر قرار رکھتے ہوئے پوری صحت و اتصال کے ساتھ نسل در نسل انھیں منتقل کرنا بھی تھا تاکہ مدوّنہ ذخیرہ احادیث شکوک و شبہات سے اس قدر بلند و بالا ہو کہ ہر فرد خواہ وہ اپنوں میں سے ہو یا اغیار میں سے، دیکھتے ہی یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو جائے کہ یہ ذخیرہ ہر قسم کی ملاوٹوں اور آمیزشوں سے پاک ہے اور حفاظت کے اس بندوبست سے بڑھ کر کوئی اور ممکن نہیں۔

ابتدا میں جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا زمانہ تھا تو نہ روایت کی ان تفصیلی قواعد و ضوابط کی ضرورت تھی، نہ اسناد کی ضرورت تھی۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جس اہتمام اور جس محبت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات، اقوال و افعال اور آپؐ کے حالات کو جمع کیا، یاد رکھا اور محفوظ کیا، وہ ضرب المثل کی حثییت رکھتا ہے۔ خود صحابہ کرام ایک دوسرے سے کسبِ فیض کیا کرتے تھے اور معلومات جمع کیا کرتے تھے۔

مشہور صحابی حضرت عبادہ بن صامتؓ، جن کے آخری ایام دمشق میں گزارے تھے، ان کو پتہ چلا کہ ایک اور صحابی حضرت عقبہ بن عامر الجہنی، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاص خدام میں شامل رہے، ان کے پاس کوئی خاص حدیث ہے، جو پہلے سے حضرت عبادہ بن صامت کے پاس پہنچ چکی تھی، لیکن وہ اس کی تصدیق کرنا چاہتے تھے۔ وہ گھوڑے پر سوار ہو کر ایک قافلے کے ساتھ کئی ماہ کی مسافت طے کر کے حضرت عقبہ الجہنی کے پاس پہنچے۔ دروازہ کھٹکٹایا، وہ باہر نکلے، وہیں کھڑے کھڑے سلام دعا کی اور پوچھا کہ اس حدیث کے اصل الفاظ کیا ہیں؟ انھوں نے حدیث کے الفاظ سنا ئے، جو ان کی یاداشت کے مطابق تھے تو انھوں نے کہا کہ الحمد اللہ مجھ تک جس ذریعے سے یہ حدیث پہنچی تھی، وہ بالکل درست ہے۔ اب میں جارہا ہوں اور یہ کہ کر اجازت لی اور رخصت ہو گئے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خود صحابہ کرام نے کس محنت سے اور کس محبت اور احترام سے احا دیث رسولؐ کے بارے میں معلومات جمع کرنی شروع کیں۔

فنِ اسماء الرجال:

خارجی نقد حدیث کی اساس علم روایت پر اور علم روایت کی اساس سند پر اور سند کی اساس رجال پر ہے۔ گویا رجال وہ بنیادی مضمون ہے جس کی بنیاد پر اسناد کا تعین ہوتا ہے اور اسناد کی بنیاد پر کسی حدیث کی خارجی نقد پر بات ہوتی ہے۔ اور خارجی نقد پر بات کرنے کے بعد گویا تحقیق کا ایک پہلو مکمل ہو جاتا ہے اور یہ طے ہو جاتا ہے کہ خارجی وسائل اور نقد کے اعتبار سے اس حدیث کا کیا درجہ ہے۔ علم الرجال کے ضمن میں غازی (6) لکھتے ہیں:

> "راویوں کے حالات جمع کرنے کو علم الرجال کہا جاتا ہے۔ علم الرجال سے یہ نہ سمجھے گا کہ اس سے صرف مراد مرد ہیں یہ صرف ایک اصطلاح ہے۔ علم الرجال میں خواتین کا بھی تذکرہ ہوتا ہے۔ علم الرجال کی کوئی کتاب ایسی نہیں ہے جس میں خواتین راویوں کے تذکرے نہ ہوں اس لیے رجال کے لفظ سے کوئی غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے۔ اس میں ان تمام راویوں اور روایات کا تذکرہ ہوتا ہے جنھوں نے علم حدیث کی روایت کی ہے۔ جیسے جیسے علم حدیث میں روایات اور رجال کا دائرہ بڑھتا گیا، علم حدیث میں اختصاص بھی پیدا ہوتا گیا۔"

یہ ضرورت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دور کے بعد اس وقت پیش آئی جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم دنیا سے اٹھ گئے اور بہت تھوڑی تعداد میں رہ گئے۔ کبار تا بعین کا زمانہ بھی تقریباً ختم ہو گیا اور صغار تابعین کا زمانہ آگیا۔ کبار تابعین کے زمانے تک بھی یہ امکان نہیں تھا کہ کوئی شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی سے کوئی کچی بات منسوب کر دے، غلط بات منسوب کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ لیکن اس کا امکان بہر حال موجود رہتا تھا

کہ یاداشت میں کوئی کمزوری آجائے، کوئی دو احادیث کا مضمون ایک دوسرے میں مل جائے یا ایک حدیث کا مضمون دو الگ الگ مضامین کے طور پر بیان ہو جائے، اس طرح کا امکان موجود تھا۔ صحابہ کرام کی حد تک تو اس امکان کی بھی گنجائش نہیں تھی اس لئے کے ان کے ہاں حدیث رسولؐ کو حاصل کرنے اور محفوظ رکھنے کا بہت اہتمام تھا۔ اس کا اندازہ واقعات سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ اسماء الرجال کی تعریف کرتے ہوئے اشرف / رباب (7) لکھتے ہیں:

"اسماء الرجال حدیث کی جانچ پرکھ اور اسناد کے لیے راویانِ حدیث کی سوانح عمریوں اور خصائص کا علم ہے۔ اس میں راوی کے نام ولقب، قوم و وطن، ولادت، وفات، علم و فضل، دیانت و تقویٰ، حفظ، زکاوت، صحت و مرض وغیرہ کا بیان ہوتا ہے۔ اس علم کے ذریعے احادیث نے بہت سے نکات کو حل کیا ہے۔"

فن اسماء الرجال کی اہمیت کے حوالے سے ظفر (8) رقم طراز ہیں:

"مسلمانوں میں سلسلۂ نسب اور اسماء الرجال کا ہونا ایک امتیاز کی بات ہے اور یہ شرف حدیث نبویؐ کی عظمت کی بنا پر حاصل ہوا۔ اس علم میں یہ تحقیق کی جاتی ہے کہ جو حضرات سلسلہ روایت حدیث میں ہیں، وہ کون تھے؟ کہاں سے تھے؟ کیسے تھے؟ ان کا سلسلہ نسب کیا تھا؟ ان کی سمجھ کیسی تھی؟ ان کے مشاغل کیا تھے؟ ان کا چال چلن کیسا تھا؟ سطحی الذہن تھے یا نکتہ رس تھے؟ کس تخیل اور کس مشرب کے تھے؟ ان کا سن پیدائش ووفات کیا تھا؟ کہاں رہے؟ کن سے علم حاصل کیا؟ ان کے شاگرد کون تھے؟ تقویٰ اور پرہیزگاری میں ان کا مقام کیا تھا؟ تاکہ ان کے ذریعے سے حدیث کی صحت و سقم دریافت کی جاسکے۔ ان اجزائی باتوں کا دریافت کرنا اور ان کا اندازہ لگانا مشکل کام تھا لیکن محدثین نے اپنی عمریں اس کام کے لیے خرچ کیں اور رحلات کے ذریعے ایک ایک شہر کے راویوں کے حالات دریافت کیے۔ انھی تحقیقات کے ذریعے سے اسماء الرجال کا ایک عظیم الشان فن ایجاد ہوا جس کی ایجاد و تشکیل کا شرف مسلمانوں کو حاصل ہوا۔"

حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ سے جب کوئی پوچھتا تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے کیا فرمایا تو وہ براہِ راست جواب نہیں دیا کرتے تھے، بلکہ اپنی فہم اور دانست کو بیان کر دیا کرتے تھے، اور جوابا یہ بات ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ حدیث میں آیا ہے کہ من كذب على متعمداً فا ليتبوا مقعده من النار، "جو شخص جان بوجھ کر مجھ پر جھوٹ بولے وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں کر لے۔" اس لئے وہ حتی الامکان حدیث بیان کرنے سے ہی احتراز کیا کرتے تھے کہ اس میں اگر ایک فی ہزار بھی غلطی کا امکان ہو تو اس وعید کے مستحق نہ بن جائیں۔ ایک مرتبہ ضرورت پڑ گئی اور وہ حدیث کے الفاظ بیان کرنے لگے، تو پریشانی اور گھبراہٹ کے عالم میں کھڑے ہو گئے اور حدیث بیان کرنے کے بعد کہا کہ او قر يباً من ذالك او شبيهاً من ذالك۔ تقریباً ایسی بات فرمائی تھی، اس سے ملتی جلتی بات فرمائی تھی یا اس سے مشابہ بات فرمائی تھی اور پھر بہت ہی پریشانی کا اظہار کیا کہ ہو سکتا ہے کہ میری یاداشت میں کوئی کمزوری رہ گئی ہو۔ غرض انتہائی غیر معمولی اہتمام کے ساتھ انھوں نے یہ چیز بیان فرمائی۔ کبار تابعین کا بھی یہی رویہ تھا۔ لیکن جب صغار تابعین کا دور آیا۔ اور یہ زمانہ پہلی صدی ہجری کا نصف دوم ہے، اس وقت اس کا احساس ہونے لگا کہ بعض لوگ احادیث بیان کرنے میں اخلاق اور تقویٰ کا وہ معیار برقرار نہیں رکھ پا رہے ہیں جو معیار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے رکھا تھا۔ اس وقت اس بات کی ضرورت پیش آئی کی تابعین سے یہ پوچھا جائے کہ آپ نے کس صحابیؓ سے یہ روایت سنی۔ تابعین میں بھی جو کبار تابعین تھے جن کا علم اور تقویٰ غیر معمولی طور پر ضرب المثل تھا، ان سے یہ پوچھنے کی ضرورت پیش نہیں آتی تھی۔ لیکن صغار تابعین سے، جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور حضور ﷺ کے زمانہ سے دور ہونے کی وجہ سے، جن کے بارے میں یہ امکان موجود تھا کہ شاید ان کے ہاں مطلوبہ احتیاط برقرار نہ رہے۔ ان سے یہ پوچھا جاتا تھا کہ آپ نے یہ حدیث کس صحابیؓ سے یا کس تابعی سے سنی ہے۔

سند کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟

حضرت سلیمان ثوری جن کا شمار صغار تابعین میں ہوتا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ پہلے حدیث کی سند پوچھنے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ جب حدیث کے راویوں نے غلط بیانیوں سے کام لینا شروع کیا تو ہم نے ان کے لئے تاریخ کا وسیلہ اور تاریخ کا ہتھیار استعمال کرنا شروع کر دیا۔ تاریخ کے ہتھیار سے مراد یہ ہے کہ جب کوئی صاحب کوئی حدیث بیان کرتے تھے۔ وہ زمانہ تابعین یا تبع تابعین کا تھا، تو ان سے پوچھا جاتا تھا کہ انھوں نے یہ حدیث کس صحابیؓ سے سنی۔ صحابیؓ کا نام لینے کے بعد وہ یہ تعین کرتے تھے کہ ان صحابیؓ کی وفات کس سن میں ہوئی، وہ صحابیؓ کس علاقہ میں قیام پذیر تھے۔ راوی کی اہمیت کے تناظر میں خاں (9) لکھتے ہیں:

"راوی کی شخصیت بہت اہمیت رکھتی ہے۔ جن لوگوں کے متعلق معلوم ہے کہ وہ واقعہ تراشی اور داستان سرائی سے بھی بلا تکلف کام لیا کرتے تھے یا کوئی صاحب اس قدر خوش گمان اور زود یقین ہے کہ تحقیق کی مشکل پسندی کے حریف نہیں ہو سکتے تو ایسے مؤلفین اور راویوں کے فرمودات اور مختارات کو اس وقت تک بنائے استدلال نہیں بنایا جانا چاہیے جب تک کہ کسی معتبر ذریعے سے تصدیق نہ ہو جائے۔"

اور اس طرح سے یہ اندازہ ہو جاتا تھا کہ بیان کرنے والے نے حدیث صحیح بیان کی ہے یا اس میں کوئی جھول رہ گیا ہے۔ مثال کے طور پر ایک صاحب نے، جن کا تعلق تبع تابعین سے تھا، انھوں نے کوئی حدیث بیان کی۔ سننے والوں نے پوچھا کہ آپ نے یہ حدیث کس سے سنی ہے؟ انھوں نے بیان کیا کہ فلاں تابعی سے سنی ہے۔ پوچھا گیا کہ کس سن میں سُنی ہے تو انھوں نے کہا کہ سن ۱۰۸ھ میں سنی ہے۔ پوچھا گیا کہ سن ۱۰۸ھ میں کہاں سنی تھی تو انھوں نے کہا کہ آرمینیا میں سنی تھی۔ سوال ہوا کہ آرمینیا میں وہ کیا کرنے گئے تھے۔ انھوں نے کہا کہ جہاد کرنے گئے تھے۔ پوچھنے والے بزرگ نے کہا کہ تم غلط بیان کر رہے ہو، جھوٹ بول رہے ہو۔ ان تابعی کا انتقال ۱۰۴ھ میں ہو گیا تھا اور ۱۰۸ھ میں وہ زندہ نہیں تھے۔ اور وہ جہاد کرنے کے لئے آرمینیا نہیں بلکہ روم تشریف لے گئے تھے۔ اب یہ معلومات کہ ان تابعی کا انتقال ۱۰۴ھ میں ہوا تھا اور انھوں نے جس جہاد میں حصہ لیا تھا وہ روم کی جہادی مہم تھی، آرمینیا کی نہیں تھی اور ان دونوں کے درمیان تقریباً دواڑھائی ہزار میل کا فرق ہے۔ اس سوال وجواب، بلکہ جرح سے یہ پتہ چلا کہ ان صاحب کو بیان کرنے میں یا تو یادداشت میں التباس ہو رہا ہے یا کوئی غلط فہمی ہو رہی ہے، یا ممکن ہے انھوں نے دانستہ غلط بیانی کی ہو، اس جھول کی وجہ سے ان کی یہ روایت تبع تابعین نے قبول نہیں کی۔

اس طرح سے جب یہ واقعات کثرت سے پیش آنے شروع ہوئے اور اس کا امکان وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتا جا رہا تھا، تو پھر یہ معلومات جمع کرنے کا عمل شروع ہوا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کہاں کہاں تشریف لے گئے تھے، کس کس علاقہ میں مقیم رہے، انھوں نے وہاں جا کر کیا کیا اور کس علاقہ میں کس طرح کی سرگرمیوں میں مصروف رہے۔ مثلاً جہاد کا معاملہ تھا یا کوئی اور وجہ تھی۔ اب یہ بات کہ کسی خاص تابعی نے آرمینیا کے جہاد میں حصہ لیا یا روم کے جہاد میں حصہ لیا، اس کا براہ راست علم حدیث سے کوئی تعلق نہیں ہے، لیکن چونکہ روایت میں اس کو حوالہ دیا گیا کہ آرمینیا کے جہاد کے دوران ان سے یہ بات سنی، جب کہ انھوں نے آرمینیا میں جہاد نہیں کیا تھا۔ اس سے یہ معاملہ واضح ہو گیا، کہ کم سے کم اس تابعی کی حد تک یہ تیقن ہو گیا کہ ان کے ذریعے سے یہ روایت نہیں آئی، کسی اور کے ذریعے سے آئی ہو گی۔

یوں علم حدیث میں ایک نئے شعبے کا آغاز ہوا جس کو علمِ اسناد بھی کہتے ہیں اور علم اسناد کی بنیاد سند پر ہے اور سند میں راویوں کا تذکرہ ہوتا ہے۔ علم حدیث کے شعبوں میں ائمہ کو مہارت اور کمال کا حال مختلف رہا۔ کچھ لوگ وہ تھے جو رجال کے فن میں زیادہ ماہر تھے۔ پھر رجال سے متعلقہ علوم وفنون جن میں جرح وتعدیل بھی ہے، کچھ لوگ اس کے ماہر ہوئے، اور کچھ لوگ علم درایت، کہ حدیث کی داخلی شہادت سے اندازہ لگائیں کہ حد

یث کی داخلی شہادت سے اس کے کمزور ہونے یا نہ ہونے کا پتہ چلتا ہے یا نہیں چلتا۔کچھ حضرات تھے جو خارجی نقد و روایت اور رجال میں زیادہ مشہور تھے، کچھ حضرات تھے جو داخلی نقد اور درایت میں زیادہ مشہور تھے۔یعنی حدیث کی داخلی شہادت اور داخلی مطالعہ نقد میں۔کچھ حضرات تھے جو دونوں میں زیادہ مشہور تھے۔جو دونوں میں زیادہ مشہور تھے ان میں حضرت امام مالکؒ کا نامِ نامی بھی شامل ہے۔جو حضرات داخلی نقد و درایت میں زیادہ مشہور تھے ان میں امام ابو حنیفہؒ اور امام شافعیؒ کا نام زیادہ مشہور ہے۔جو نقل روایت میں مشہور ہیں ان میں محدثین کی بڑی تعداد شامل ہے۔لیکن محدثین میں ایسے حضرات بھی شامل تھے مثلاً امام بخاری، امام ترمذی، جو دونوں میدانوں کے شہسوار تھے۔جو روایت اور رجال کے بھی ماہر تھے اور درایت کے بھی ماہر تھے۔حدیث کی داخلی شہادت سے بھی ان کو بہت کچھ اندازہ ہو جایا کرتا تھا۔

رجال اور سند کی ضرورت پیش آنے کی ایک اور وجہ بھی ہے۔جہاں تک رسول اللہ ﷺ کے ارشادات کا تعلق ہے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس کی روایت باللفظ کیا کرتے تھے۔جو بات رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمائی اس کو اسی طرح یاد فرماتے تھے، اسی طرح لکھتے تھے اور آپس میں اپنے تحریری ذخائر کا ایک دوسرے سے تبادلہ اور تقابل کرتے رہتے تھے اور اپنی یادداشتوں کو ایک دوسرے سے چیک بھی کروایا کرتے تھے۔صحابہ کرام کی یادداشت تک تو یہ التزام موجود تھا کہ رسول اللہ ﷺ کے ارشادات کی روایت باللفظ ہو۔لیکن جو معاملات رسول اللہ ﷺ کے عمل یا سنت تقریری سے تعلق رکھتے تھے، کہ حضور ﷺ کے سامنے کوئی کام ہوا اور آپؐ نے اس کی اجازت دے دی یا منع نہیں فرمایا، اس کی روایت ہر صحابیؓ اپنے الفاظ میں بیان کیا کرتے تھے۔گویا ایک واقعہ کی تعبیریں مختلف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے مختلف انداز سے کیں۔جس نے جس طرح سے دیکھا اور سمجھا اور جس پہلو کو زیادہ اہم سمجھا، اس پہلو کو بیان فرما دیا۔جب یہ چیز تابعین تک پہنچی تو انھوں نے اس بات کا اہتمام کیا کہ جس صحابیؓ نے جو چیز الفاظ میں بیان کی اس کو انھی الفاظ میں آگے تک پہنچایا جائے اور اس کے الفاظ میں ردوبدل نہ کیا جائے۔روایت باللفظ کا یہ سلسلہ اہتمام کے ساتھ جاری رہا۔اس میں اس حدیث نبوی ﷺ سے بھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو مدد ملی جس میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ نضر اللہ امرأ، اللہ تعالیٰ اس شخص کو سرسبز و شاداب رکھے، سمیع مقا لتی، جس نے میری کوئی بات سنی، فاد ا ھا کما سمعھا، اور جیسا اس کو سنا تھا ویسے ہی اس کو روایت کر دیا۔اس سے روایت باللفظ کی اہمیت واضح ہوتی ہے کہ اگر جیسا سنا تھا ویسا ہی ادا کرو گے تو تروتازگی کی یہ بشارت ملے گی اور اگر اس کے الفاظ یا مفہوم میں تبدیلی ہوگئی تو بظاہر مفہوم یہ نکلتا ہے کہ بشارت اس طرح سے حاصل نہیں ہوگی۔

روایت بالمعنیٰ:

کچھ وقت گزرنے کے بعد محدثین کے درمیان یہ سوال پیدا ہوا کہ روایت باللفظ سے ہٹ کر اگر روایت بالمعنیٰ کی جائے تو جائز ہے یا نہیں۔لیکن روایت بالمعنیٰ کا سوال تدوین کے سلسلہ میں نہیں پیدا ہوا تھا۔تدوین کی حد تک بخاری، مسلم، ترمذی اور باقی سب کتابوں میں جب روایتیں جمع کی گئیں تو جس طرح سے آئی تھیں اسی طرح سے لکھی گئیں۔روایت باللفظ ہی کے انداز میں جمع ہوئیں۔سوال وہاں پیدا ہوا کہ جہاں کسی مجلس درس یا مجلس وعظ یا تبلیغ دعوت کے کسی عمل میں کوئی حدیث بیان کرنے کی ضرورت پیش آئے تو کیا وہاں بھی روایت باللفظ کی پابندی ضروری ہے یا روایت بالمعنیٰ بھی ہو سکتی ہے۔یہ سوال وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اہمیت اختیار کرنے لگا اور ہم ان تمام محدثین اور علماء کرام کے شکر گزار ہیں جنھوں نے یہ سوال اٹھایا اور اس معاملہ میں یہ گنجائش پیدا کی۔اگر وہ حضرات روایت بالمعنیٰ کی یہ گنجائش پیدا نہ کرتے تو آج دنیائے اسلام کے لاکھوں اور کروڑوں انسانوں کے لئے حدیث رسولؐ کا حوالہ دینا ناممکن ہو جاتا۔اس لئے کہ ہم میں سے کتنے ہیں جو حدیث کے حافظ ہیں اور ایک ایک لفظ، زیر، زبر کی پابندی کے ساتھ اور ایک شوشے کی پابندی کے ساتھ اسی طرح بیان کر سکتے ہیں۔ایسا ہو تا تو پھر لوگ حدیث کا حوالہ دینا چھوڑ

دیتے اور ہمارے لئے اس سے استفادہ کرنا عملاً مشکل ہو جاتا بلکہ ناممکن ہو جاتا۔ اس لئے محدثین نے یہ سوال اٹھایا کہ کیا روایت بالمعنیٰ جائز ہے ؟ کچھ لوگوں کا پھر بھی یہ خیال رہا کہ روایت بالمعنیٰ کسی حال میں بھی جائز نہیں ہے۔ بلکہ جو لوگ بیان کرنا چاہیں وہ پہلے یاد کریں پھر اس کے بعد بیان کریں۔ لیکن علماء کرام کی اکثریت نے بعد کے سالوں میں تیسری، چوتھی اور پانچویں صدی ہجری کے سالوں میں کچھ شرائط کے ساتھ روایت بالمعنیٰ کی اجازت دے دی۔

امام مالکؒ کا ارشاد یہ ہے کہ احادیث مرفوعہ میں تو روایت بالمعنیٰ جائز نہیں ہے۔ یعنی کوئی چیز جو رسول اللہ ﷺ سے منسوب ہے اس میں تو روایت بالمعنیٰ جائز نہیں ہے اور وہ روایت باللفظ ہی ہونی چاہیے۔ لیکن جو بقیہ احادیث ہیں جن میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی کی رائے یا کسی کا مشاہدہ یا کسی کا فتویٰ یا کسی کی روایت بیان ہوئی ہے وہ روایت بالمعنیٰ ہو سکتی ہے کیونکہ اس کے بارے میں یہ وعید نہیں آئی ہے کہ من کذب علی متعمد فا لیتبو ا مقعدہ من النار۔ یہ حدیث صرف حضور ﷺ کے ارشادات کے بارے میں آئی ہے۔ یہ امام مالکؒ کی رائے ہے جو بہت وزنی معلوم ہوتی ہے۔

علم روایت میں، جس میں روایت باللفظ اصل ہے اور روایت بالمعنیٰ کی بعد میں اجازت دی گئی ہے، یہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خود متعدد مواقع پر اپنے ارشادات کو دوسروں تک پہنچانے کا حکم دیا۔ ایک جگہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ بلغوا عنی و لو آیتہ کہ اگر میری طرف سے ایک آیت بھی تم تک پہنچی ہے تو اس کو دوسروں تک پہنچاؤ۔ اب جس شخص کے علم میں بھی رسول اللہ ﷺ کے ارشادات یا سنت کا علم آیا ہے وہ مکلّف ہے کہ جہاں تک اس کے بس میں ہو اور جہاں تک اس کے لئے آسان ہو، اسے دوسروں تک پہنچائے۔ اسی طرح خطبہ حجتہ الوداع دینے کے بعد آپؐ نے فرمایا کہ الا هَلْ بَلَغْتُ، کیا میں نے پہنچا دیا، لوگوں نے جواب دیا: ہاں آپؐ نے پہنچا دیا۔ اس پر آپ ﷺ نے فرمایا کہ فلیلغ الشاھد الغائب، کہ جو موجود ہے وہ یہ بات ان تک پہنچا دے جو موجود نہیں ہیں۔ اس لئے بہت بڑی تعداد میں ان صحابہ کرام نے خطبہ حجتہ الوداع کی روایت کی اور انھیں ان صحابہ تک پہنچایا جو وہاں موجود نہیں تھے اور ان تابعین تک جو بعد میں آئے۔ کیوں کہ فلیلغ الشاھد الغائب کا اطلاق علماء لغت کے نزدیک ہر اس شخص پر ہوتا ہے جس تک یہ حدیث پہنچے۔ اس لئے جس مجلس میں یہ حدیث بیان کی جائے تو جو شخص وہاں موجود ہو گا وہ شاہد ہو گا اور جو وہاں موجود نہیں ہو گا وہ غائب ہو گا۔ تو موجود رہنے والا موجود نہ رہنے والے تک پہنچائے۔ اور جب کوئی شخص پہنچائے گا تو وہ ایک طرح سے راوی حدیث ہو گا۔ اس کا کردار اور اس کی شخصیت زیر بحث آئیں گے۔ جب زیر بحث آئیں گے تو علم رجال وجود میں آئے گا۔ اس لئے ان احادیث کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ راویوں پر رواۃ کے بارے میں بحث ہو۔ چونکہ رواۃ اور راویان حدیث اس ارشاد نبوی ﷺ پر عمل درآمد کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ اگر راویان حدیث نہ ہوتے تو آج ہم ان ارشادات گرامی سے محروم رہتے اور ان پر عمل نہ کر سکتے۔ راویان حدیث ہی کے وسیلہ سے اور انھی کے واسطہ سے یہ ہدایت اور رہنمائی ہم تک پہنچی ہے۔ اس لئے وہ اس عمل کا ایک لازمی حصہ ہیں۔ اور اس عمل کا حصہ ہونے کی وجہ سے ان کی شخصیت کا مطالعہ بھی علم حدیث ہی کا مطالعہ ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ وہ تمام مسلمان خواتین و حضرات جو روایت حدیث، نقل حدیث، کتابت حدیث، شرح حدیث اور درس حدیث میں مصروف ہیں وہ سب کے سب اس عمل کا حصہ ہیں۔ کہ فلیلغ الشاھدالغائب پر وہ سب عمل کر رہے ہیں اور فلیلغ الشاھد الغا ئب کے حکم پر عمل کرنے کے ساتھ ساتھ وہ راویان حدیث اور علم حدیث کا بھی حصہ بنتے جا رہے ہیں۔

چناں چہ اس طرح سے ایک ایک کر کے یہ نام سامنے آتے رہے اور یہ تحقیق شروع ہوتی گئی۔ سب سے پہلے تحقیق اور راویان حدیث کی چھان بین کا یہ عمل حضرت حسن بصریؒ نے شروع کیا۔ حضرت حسن بصریؒ اور محمد بن سیرینؒ تابعین میں بڑا نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ تین تابعین کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ سیّد التابعین ہیں۔ ایک سعید المسیب، جو حضرت ابو ہریرہؓ کے شاگرد خاص اور داماد تھے اور طویل عرصہ ان کے ساتھ رہے۔ دوسرے حضرت حسن بصریؒ جن کے بارے میں کہا گیا کہ وہ سید التابعین ہیں۔ اور تیسرے حضرت محمد بن سیرینؒ جو تابعین میں بڑا نمایاں مقام رکھتے تھے۔

علم طبقات اور علم الرجال:

حضرت حسن بصریؒ اور محمد بن سیرینؒ نے رجال کے کام کا آغاز کیا۔ اور ایک طرح سے یہ دونوں حضرات علم رجال کے بانی ہیں۔ انھوں نے سب سے پہلے یہ معلومات جمع کیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کہاں کہاں تشریف لے گئے۔ اس ضمن میں پہلا کام یہ تھا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں مکمل معلومات جمع کی جائیں، مشاہیر صحابہ کے بارے میں تو سب کو معلوم ہے لہٰذا ان کے بارے میں زیادہ تحقیق کی ضرورت نہیں پڑی۔ لیکن خطبہ حجتہ الوداع میں ایک لاکھ چوبیس یا چالیس ہزار صحابہ موجود تھے، ان کے علاوہ بھی بہت سے صحابہ تھے جو اس موقع پر حج کے لئے تشریف نہیں لائے تھے۔ ان میں سے ہر ایک کو ہر شخص نہیں جانتا تھا۔ پہلا کام تو یہ تھا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے حالات کو جمع کیا جائے اور ان کے تذکروں پر مبنی کتابیں تیار کی جائیں تاکہ پتہ چل جائے کہ کون لوگ صحابیؓ تھے اور کون نہیں تھے۔

لہٰذا سب سے پہلے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا تذکرہ کرتے ہوئے جمع و تدوین کا کام شروع ہو گیا۔ جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مدینہ منورہ سے نکل کر کوفہ، بصرہ، دمشق، مصر اور دیگر مختلف جگہوں میں آباد ہوئے تو اس بات کی بھی ضرورت پیش آئی کہ جو صحابیؓ جہاں جا کر بسے ہیں وہاں جا کر ان کا تذکرہ لکھا جائے۔ چنانچہ ان صحابہ پر الگ الگ کتابیں لکھی گئیں جو کوفہ میں جا کر بسے، جو بصرہ میں جا کر بسے، جو دمشق اور قاہرہ میں جا کر بسے اور (ان صحابہ کے بارے میں ایک کتاب ہماری اردو زبان میں بھی ہے) جو سندھ میں آ کر بسے۔ ہندوستان کے ایک بزرگ تھے قاضی اطہر مبارک پوری، انھوں نے ایک کتاب لکھی جس میں انھوں نے ان صحابہ کے حالات لکھے جو سندھ میں تشریف لائے، اور سندھ میں آباد ہوئے اور یہیں ان کا انتقال ہوا۔ اور اس طرح سے ہر شہر اور علاقے کے صحابہ پر الگ الگ کتابیں آ گئیں جس کے بعد یہ ممکن نہیں رہا کہ کوئی شخص غلط طور پر یہ دعویٰ کرے کہ فلاں صحابیؓ نے مجھ سے یہ بیان کیا۔ اسی طرح یہ امکان بھی نہیں رہا کہ ایک صاحب صحابیؓ نہ ہوں اور بعد میں یہ دعویٰ کریں کہ میں صحابیؓ ہوں۔ مثال کے طور پر کوئی شخص سمرقند جائے اور یہ دعویٰ کرے کہ میں صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہوں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔ اگرچہ ایسا نہیں ہوا۔ لیکن چوں کہ امکان موجود تھا اس لئے اس امکان کا سدباب کرنے کے لئے ان تابعین حضرات نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے تذکرے الگ الگ بھی جمع کئے، شہر وار بھی جمع کئے، قبیلہ وار بھی جمع کئے اور مختلف جنگوں کے حساب سے بھی جمع کئے کہ کس جنگ میں کون کون سے صحابیؓ شریک ہوئے۔ تاکہ یہ پتہ چلے کہ کون سے صحابیؓ سمرقند تشریف لے گئے تھے اور کون سے صحابیؓ آرمینیا تشریف لے گئے تھے، تاکہ وہاں اگر کوئی روایت ان کے نام سے آئے تو تحقیق کی جا سکے کہ وہ وہاں تشریف لے بھی گئے تھے یا نہیں۔ ہندوستان میں ایک شخص تھا، غالباً جنوبی ہندوستان میں، بمبئی یا حیدر آباد دکن کا رہنے والا تھا۔ اس کا نام بابا رتن تھا۔ چھٹی صدی ہجری میں تھا اور اس نے طویل عمر پائی تھی۔ ایک اندازے کے مطابق غالباً دو سوا دو سو سال اس کی عمر تھی۔ اس نے دعویٰ کیا کہ میری عمر سات سو سال ہے اور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں موجود تھا۔ چنانچہ معجزہ شق القمر کے بعد جب میں نے دیکھا کہ چاند کے دو ٹکڑے ہو گئے تو میں عرب پہنچا۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ آ چکے تھے۔ میں مدینہ

پہنچا، وہاں جا کر مسلمان ہوا اور آپ ﷺ کے پاس تین چار مہینے رہا، پھر آپ ﷺ نے مجھ سے کہا کہ اپنے علاقہ میں جا کر تبلیغ کرو تو میں واپس ہندوستان آ گیا۔ بہت سے لوگوں نے اس کی باتیں مان لیں اور اس کا بہت چرچا ہوا۔ لوگ دور دور سے اس کے پاس آنا شروع ہو گئے۔ اس کی خوب پیری مریدی چلی اور بڑی شہرت ہوئی۔ اس پر علماء حدیث کے سامنے سوال پیدا ہوا کہ اس شخص کے دعویٰ کی کیا حیثیت ہے۔ محدثین نے لکھا کہ یہ بالکل جھوٹ ہے، ایسا کوئی آدمی صحابی رسول قرار نہیں دیا جا سکتا۔ لیکن اس کے نام سے روایات مشہور ہونا شروع ہو گئیں۔ اقبال(10) نے ایک جگہ کہا ہے:

تا ویل کا پھندا کوئی صیاد لگا دے
یہ شاخ نشیمن سے اترتا ہے بہت جلد

یعنی ہندوستان کے مسلمان تاویل کے پھندے میں بہت جلدی پھنس جاتے ہیں۔ یہ ہندوستان کے مسلمانوں کا ایک کمزور پہلو ہے۔ لیکن بابا رتن کے علاوہ ایک دوسرے شخص نے بھی ایسا ہی دعویٰ کیا لیکن علماء حدیث نے بڑی صراحت اور قطعیت کے ساتھ کہا کہ دونوں جھوٹے ہیں اور ان دونوں کو دجّال اور کذّاب قرار دیا گیا۔ ان کی کوئی بات نہ سنی جائے۔ چناں چہ بہت جلد وہ فتنہ ختم ہو گیا۔ صحابہ کرامؓ کے بعد جیسے جیسے زمانہ بڑھتا گیا علماء حدیث علم الرجال پر معلومات جمع کرتے رہے اور بالآخر پانچویں صدی ہجری تک معلومات مکمل طور پر جمع ہو گئیں۔ امام بیہقی آخری محدث ہیں جن کی وفات ۴۵۸ھ میں ہوئی ہے اور جنھوں نے براہ راست احادیث کی روایت کر کے اپنا مجموعہ مرتب کیا۔ اس کے بعد کے مجموعے ہیں وہ براہ راست مجموعے نہیں ہیں۔ بلکہ سابقہ مجموعوں کی بنیاد پر مرتب ہونے والے نئے مجموعے ہیں جن کو ثانوی مجموعے کہا جا سکتا ہے۔

اس کے بعد علم الرجال کی اس طرح ضرورت نہیں رہی جیسے روایت حدیث کے ضمن میں پیش آتی تھی۔ لیکن علماء حدیث کے تذکرے ہمیشہ مرتب کئے گئے اس لئے کہ علم حدیث کا درس زبانی بھی ہوا کرتا تھا اور تحریری بھی ہوا کرتا تھا۔ یہ تیقن کرنے کے لئے کہ کس شخص نے کتنے بڑے محدث سے حدیث پڑھی ہے اور صاحب علم کا درجہ اپنے استادوں کے لحاظ سے کیا ہے، یہ جاننے کے لئے محدثین کے تذکرے جمع کئے جاتے تھے۔ اور آج تک جمع کئے جا رہے ہیں۔

پندرھویں صدی ہجری کے اوائل اور چودھویں صدی ہجری کے آخر تک تمام محدثین کے تذکرے مطبوعہ شکل میں موجود ہیں اور ہم یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ علم حدیث کی خدمت کن کن لوگوں نے کی ہے۔ یہ ساری شخصیات جن کے نام جمع ہوئے ان کا مطالعہ مسلمانوں نے بھی کیا اور غیر مسلموں نے بھی کیا۔ یہ ایسا علم ہے کہ پانچ چھ لاکھ شخصیات کا تذکرہ ہمارے سامنے آ جاتا ہے اور ان پانچ چھ لاکھ شخصیات کی بنیاد پر ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ کسی شخص نے حضور ﷺ کے بارے میں جو بیان دیا اس کی تاریخی حیثیت کیا ہے۔ جب رجال پر باقاعدہ کتابیں لکھنے کا کام شروع ہوا تو حسن بصریؒ کے زمانہ میں شروع ہوا لیکن حسن بصری کی لکھی ہوئی کوئی کتاب آج ہمارے پاس موجود نہیں ہے۔ ان کے بعد جن لوگو ں نے لکھا وہ کتابیں ہمارے سامنے ہیں اور ان کی بنیاد پر ہم بتا سکتے ہیں کہ اس کا آغاز کب ہوا۔

حوالہ جات وحواشی:

(1) دہلوی،سیّد احمد(2010ء)فرہنگِ آصفیہ (جلد دوم)،لاہور،اردو سائنس بورڈ،ص378

(2) عباسی،حمید اللہ خان(2015ء)اصولِ تحقیق،اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن،ص63

(3) ظفر، محمود احمد(2013ء)تاریخِ اسلام عہدِ نبویؐ تا عہدِ خلفائے راشدین،لاہور، نشریات الحمد مارکیٹ اردو بازار،ص324

(4) القرآن،سورۃ الحجرات، آیت6

(5) قاسمی، محمد سلیم(2004ء)روایت ودرایت حدیث،ایک تجزیاتی مطالعہ،سہارن پور(یو۔پی)،دارالکتاب دیوبند،ص159

(6) غازی، محمود احمد(2012ء)محاضرات حدیث،لاہور،الفیصل ناشران،ص188

(7) اشرف، محمد خاں / رباب، عظمت(2011ء)اصطلاحاتِ تدوینِ متن،لاہور،سنگِ میل پبلی کیشنز،ص202

(8) ظفر،عبدالرؤف(2009ء)علوم الحدیث،فنی،فکری اور تاریخی جائزہ،لاہور،کتاب سرائے،ص108

(9) خاں،رشید حسن(1990ء)ادبی تحقیق،مسائل اور تجزیہ،لکھنؤ،اترپردیش اردو اکادمی،ص16

(10)اقبال، محمد(2021ء)کلیاتِ اقبال اردو،ضربِ کلیم،لاہور،اقبال اکادمی،ص857

BIBLOGRAPHY

Abdul Rauf Zafar, *Uloom al Hadith Fikari, Fanni Aur Tareekhi Jaeza*,(Lahore: Kitab Saraye,2009).

Hakeem Mahmood Ahmad Zafar,*Tareekh e Islam Ehad e Nabwi ta Ehad e Khulfa e Rashdeen*,(Lahore:Nashriyat Al Hamd Market Urdu Bazar, 2013).

Hameed Ullah Khan Abbasi, *Asool e Tahqiq*,(Islam Abad: National Book Foundation, 2015).

Mahmood Ahmad Ghazi, *Mahazrat e Hadith*,(Lahore: Al Faisal Nashraan,2012).

Muhammad Khan Ashraf, Azmat Rubab, *Istlahat e Tadveen e Matn*,(Lahore:Sang e Mil Publications,2011).

Muhammad Iqbal, *Kuliyat e Iqbal Urdu, Zarb e Kaleem*,(Lahore: Iqbal Academy Pakistan,2021).

Muhammad Saleem Qasmi, *Riwayat o Daraiyat e Hadith Aik Tajziyati Mutaleya*,(Saharan Pur,U.P: Dar ul Kitab Deoband, January 2004).

Rasheed Hassan Khan, *Adabi Tahqeeq Masail aur Tajziya*, (Lakhnow: Utar Pardesh Urdu Academy, 1990).

Syed Ahmad Dehlvi, Farhang e Asfiya(Jild-II),(Lahore: Urdu Science Board Uppar Maal, 2010).